انتظار حسین کے ناولوں میں متبادل بیانیہ

خالد منیر چودھری
قاضی عابد

Abstract:

Pakistani Fiction most of the times presented counter narrative against different powerful narratives and narratives of the powerful.This article mainly focuses on how Pakistani Novel destabilizes hegemony of ideological, political and discursive narratives and presented a parallel or counter narrative against them. The paper is based on the literary work of Entizaar Hussain.

انتظار حسین کا تخلیقی تجربہ پیچیدہ نوعیت کا ہے اور اس کا سبب وہ تہذیبی سوالات ہیں جن کا سامنا انہوں نے اپنے فن میں کیا۔ انسانی زندگی کی حقیقت اور ماہیت، وقت کا تصور، کائنات کا مقصد اور کونیاتی معاملات کے بارے میں سوالات دنیا کے سارے ادب میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن انتظار حسین نے ان سوالوں کے جواب تہذیبی سطح پر تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے لیے اساطیر، مذہبی روایات اور اس خطے کی مشرقی دانش کی روایت کو اپنے مآخذات کے طور پر لیا ہے۔ انتظار حسین کی تحریروں میں ہمیں ہند اسلامی تہذیب کی جھلکیاں جا بجا ملتی ہیں۔ مہا بھارت، بھگود گیتا اور بدھ کی جاتک کہانیاں بھی ان کے مآخذات ہیں، انتظار حسین کی کہانیوں میں ملنیوالی یہ تہذیب ایک ایسی معاشرت کا نقشہ پیش کر رہی ہے جو اجتماعیت یا تکثیریت پر مبنی تہذیب ہے اور یہاں یہ جان لینا ضروری ہے کہ انتظار حسین اس ہند اسلامی تہذیب کا ذکر بار بار کرنے اور اس کے تاریخی واقعات کو موجودہ حالات کے ساتھ موازنہ کرنے کے حوالے سے اس لیے پیش کرتے ہیں کہ وہ اس تہذیب کی بازیافت چاہتے ہیں ہماری گمشدہ اور فراموش قدروں کی بازیافت چاہتے ہیں اور اس بنیاد پر ہم یہ نتیجہ قائم کر سکتے ہیں کہ انتظار حسین کی تحریریں ہمارے ہاں رائج یا تشکیل کیے ہوئے کئی بیانیوں کے لیئے متبادل بیانیہ بن جاتی ہیں۔

> ''انتظار حسین نے ان متعین موضوعات، مروجہ ادبی اقدار، ثقافتی ترجیحات اور تصور کائنات کو subvert کرنے کی خاطر ایک ایسا بیانیہ تخلیق کیا ہے جس پر کسی نجات کوش فلسفے کی فضا مستولی نہیں ہے۔ ان کے نزدیک داخلی کائنات پر اصرار بھی Platitude کی صورت نمایاں ہوا ہے۔

انتظار حسین کے بیش تر افسانوں کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ عقلیت پسندی دراصل ثقافتی استعماریت کی ایک شکل ہے اور اسے subvert کرنے کے لیے انہوں نے ایک ایسا بیانیہ خلق کیا ہے جس کی اساس سکہ رائج الوقت Rationalism کی بجائے beliefincredible پر استوار ہے۔''(1)

مسلک اہل تشیع سے تعلق کی وجہ سے ناقدین ان کی تحریروں میں موجود ان کے مجلس اور رقت کے ذکر اور دوسرے رسوم رواج کے حوالے سے اعتراض کرتے ہیں۔لیکن ان کے کرداروں کے رویوں میں یہ رقت ان کے مجموعی مزاج میں پائی جانے والی نرم دلی بھی تو ظاہر کرتی ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر اسی حوالے سے لکھتے ہیں۔

''انتظار حسین کی دنیا میں آنا ہو تو اس کے لیئے بہت سے مسلمات اور معیارات سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے جن کے ہم عادی ہیں۔اس کے کردار، اس کے افسانوں کی زبان، وہاں کی فضا اور سب سے بڑھ کر زندگی کے بارے میں اس کا مخصوص رویہ اور اس رویہ سے جنم لینے والی ویژن۔ یہ سب ہماری یوں Deconditioning کرتے ہیں کہ ہم چونک اٹھتے ہیں۔''(2)

انتظار حسین کے ناول ''بستی (۱۹۷۹ء)'' میں ذاکر، اس کے ماں باپ، ذاکر کی خالہ زاد صابرہ، حکیم بندے علی خان، منشی مصیب حسین، سلامت، کرامت، افضال وہ کردار ہیں جن کی کہانی اس ناول میں بیان کی گئی ہے۔اور یہ بستی جس کا قصہ ہے غیر منقسم ہندوستان کا شہر روپ نگر جو علامتی طور پر سارا ہندوستان ہے اور بعد از تقسیم لاہور جو کہ پاکستان کی نمائندگی کر رہا ہے۔اس خطے میں بسنے والے لوگوں کی زندگی میں جو تبدیلیاں تقسیم کے بعد ہوئیں ان کا احوال تاریخ کے متبادل کے طور پر ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے۔تقسیم سے پہلے روپ نگر میں مقیم اس خاندان کے ساتھ ساتھ حکیم بندے علی خان، منشی مصیب، بھگت جی، لالہ ہردیال، ڈاکٹر جوشی اسی ایک خاندان کے افراد کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔اور فکر و دانش کی سطح یہ ہے کہ جب حکیم بندے علی خان ذاکر کے ابا جان سے سوالات کر رہے ہیں تو ان کے جوابات ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات کی پیشین گوئی کر رہے ہیں۔یہ اقتباس دیکھیے۔

''مولانا! قیامت کب آئے گی؟''

''جب مچھر مر جائے گا اور گائے بے خوف ہو جائے گی''

''مچھر کب مرے گا اور گائے کب بے خوف ہو گی؟''

''جب سورج مغرب سے نکلے گا''

''سورج مغرب سے کب نکلے گا؟''

''جب مرغی بانگ دے گی اور مرغا گونگا ہو جائے گا''

مرغی کب بانگ دے گی اور مرغا کب گونگا ہوگا؟''

''جب کلام کرنے والے چپ ہو جائیں گے اور جوتے کے تسمے باتیں کریں گے۔''

'' کلام کرنے والے کب چپ ہو جائیں گے اور جوتے کے تسمے کب باتیں کریں گے؟''

''جب حاکم ظالم ہو جائیں گے اور رعایا خاک چاٹے گی''(3)

ہندوستان میں ایک مذہب سے تعلق نہ رکھنے کے باجود ایک ہی خاندان کی طرح رہنے والے لوگ جب ایک ایسی بستی میں پہنچتے ہیں جہاں سب ایک ہی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک ہی مذہب کے نعرے پر اکٹھے ہوئے ہیں لیکن حالات کی صورت کچھ اور ہی دکھائی دیتی ہے۔ یہاں انتظار حسین نے تقسیم سے پہلی زندگی اور تقسیم کے بعد کی زندگی کا موازنہ پیش کر دیا ہے۔ جہاں تقسیم سے پہلے کا شہر روپ نگر ان کے لیئے جنت جیسا تھا تقسیم کے بعد نصیب ہونے والی بستی یعنی لاہور اس سے یکسر مختلف نظر آتا ہے۔ سیاسی گہما گہمی کے دوران جلسے جلوسوں میں جو ہو رہا ہے اس کے بارے میں ذاکر یہ سوچ رہا ہے کہ'' آج کل تو جلسوں میں یہی ہوتا ہے۔ گالی سے شروع ہوتے ہیں اور گولی پر ختم ہوتے ہیں۔

''اور ابا جان کی بات ذہن میں گونجتی ہے۔'' پاکستان پہ اللہ رحم کرے، لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔'' ابا جان کا فقرہ ذہن میں گونجا۔ واقعی لوگوں کو ہو کیا گیا ہے؟ اس نے سنجیدگی سے سوچا۔ گھروں میں، دفتروں میں، ریستورانوں میں، گلیوں بازاروں میں سب جگہ ایک ہی نقشہ ہے۔ بحث پہلے نظریات، پھر ذاتی، پھر تو تکار، پھر گالم گلوچ، پھر سر پھٹول۔ راہ چلتے لوگوں کا ٹھٹک کر کھڑے ہو جانا، لڑنے والوں کو دہشت سے تکنا، پھر ایک دوسرے سے پوچھنا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ ہر ایک کی آنکھوں میں ایک خوف، جیسے واقعی کچھ ہونے والا ہے۔ پھر اپنی اپنی راہ چل پڑنا اور بھول جانا کہ کچھ ہوا ہے۔ جیسے کچھ نہیں ہوگا۔ اتنی تشویش اور اتنی بے اعتنائی! یکا یک کوئی افواہ جیسے دفعتہً آندھی لوگوں کو آلیتی ہے۔ چہروں پر پھیلتا ہوا خوف و ہراس، پھر وہی تشویش بھرا سوال کہ پاکستان میں کیا ہونے والا ہے۔ پھر اپنی اپنی راہ پر چل پڑنا اور بھول جانا، جیسے کچھ نہیں ہوا ہے۔ جیسے کچھ نہیں ہوگا۔ مگر کیا واقعی کچھ ہونے والا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ آگے کچھ نظر نہیں آتا تو پیچھے چل پڑنا، پھر وہی یادوں کی گھنی بنی میں لمبا سفر۔ جب میں روپ نگر میں تھا، میری زندگی کا دیو مالائی زمانہ۔ پھر جب میں ویاس پور آتا.....ویاس پور.....''(4)

انتظار حسین کے بارے میں ناقدین اکثر ان کی ماضی پرستی کا حوالہ پیش کرتے ہیں لیکن اگر بغور دیکھا

جائے تو ان کے ہاں ماضی کے احیاء کا نہیں ماضی کی قدروں کی بازیافت کی خواہش کارفرما نظر آتی ہے۔ ڈبائی کو یاد کرنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ڈبائی بطور ایک شہر کے ان کے لیے بہت اہم تھا بلکہ اس زمانے کی وہ تمام قدریں جو اس شہر میں بسنے والے لوگوں سے منسوب تھیں وہ ان کی یاد سے محو نہیں ہوسکیں۔ البتہ ہجرت کا دکھ اور اس تجربے کی اذیت ان کے ہاں بار بار ظاہر ہوتی ہے۔ ہجرت کے اس تجربے کے چند برس بعد مشرقی پاکستان کی علیحدگی بھی حساس انسانوں کے لیئے سینے کا ایک اور داغ ثابت ہوئی۔ شیراز میں بیٹھے لوگ جو بنیادی طور پر صرف باتیں ہی کرتے ہیں اور عملی طور پر یا تو کچھ کرنے کے قابل نہیں ہیں یا ان کو موقع نہیں مل رہا اور وہ ان سب حالات پر کڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ سفید بالوں والا شخص جسے بہت دنوں سے ذاکر اور اس کے دوست وہاں آتا جاتا دیکھتے ہیں جب ان سے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بارے بات کرتا ہے تو عرفان کے سوال کے جواب میں دو باتیں کہتا ہے جو دونوں غور طلب ہیں۔

> ''سفید بالوں والے نے کہا۔'' یہ تو میں نہیں جانتا کہ یہ اچھا ہوا ہے یا نہیں، اتنا جانتا ہوں کہ اگر اس طرح پاکستان کو بچایا جاسکتا ہے تو.....''..... ''میں جب گھر سے چلا تھا تو میرے سارے بال سیاہ تھے،.....اس وقت میری عمر ہی کیا تھی؟ بیس اکیس کے پیٹے میں تھا۔ جب پاکستان پہنچا اور نہانے کے بعد آئینہ دیکھا تو میرے سر کے سارے بال سفید ہو چکے تھے۔ یہ پاکستان میں میرا پہلا دن تھا۔ گھر سے کالے بالوں اور خاندان والوں کے ساتھ نکلا تھا۔ پاکستان پہنچا تو میرا سر سفید تھا اور میں اکیلا تھا۔''(5)

ہجرت کے تجربے کی اذیت کا اظہار اس سے بہتر نہیں ہوسکتا تھا۔ اور پھر ایک فلاحی مملکت کے نعرے سنتے سنتے جب وہ خوابوں کی اس سرزمین پر پہنچتے ہیں تو وہاں کے حالات ان کے لیئے مزید دکھ کا باعث بنتے ہیں۔ اپنے شہر اور جس جگہ آپ کی عمر کا ایک حصہ گذرا ہو اس مٹی سے کیا انسیت ہوسکتی ہے اور بستیوں کے خالی ہونے کا دکھ کیا ہے یہ مندرجہ ذیل اقتباس میں ملاحظہ کیجیے۔ اور سفید بالوں والے کے ہجرت کے تجربے کے نتیجے میں سفید ہونے والے بالوں کے ساتھ ساتھ عرفان کے بالوں کی سفیدی کی وجہ دیکھیے۔

> ''شہروں سے نکلے ہوئے شہروں کی امانتیں سروں پہ اٹھائے ہوئے یہی ہوتا ہے۔ شہر چھوٹ کر بھی نہیں چھٹتے، پھر تو جڑ پکڑ لیتے ہیں۔ زمین اس وقت گھیرا ڈالتی ہے، جب قدموں تلے سے سرک جاتی ہے اور بے شک مٹی کی پکڑ سخت ہوتی ہے۔ مگر مولوی دیا سلائی؟ وہ کہاں کا رہنے والا تھا؟ نہ کسی سے بولنا، نہ بات کرنا، اپنے آپ میں گم اور ان ماچس کی ڈبیوں میں جو خالی ادھ کھلی سامنے بچھی بساط پر پڑی رہتیں۔ مولوی دیا سلائی! یہ ڈبیاں کیسی ہیں؟ بابو جی! یہ بستیاں ہیں۔ مولوی دیا

سلائی! ان میں تیلیاں تو ہیں ہی نہیں، سب خالی ہیں۔ بابو! بستیاں خالی ہوگئیں۔''

''مگر ہمارے بال ہجرت میں نہیں، پاکستان کی دھوپ میں سفید ہوئے ہیں۔''(6)

یہاں ہمیں واضح طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت کی نوجوان نسل گو زندگی کی بے معنویت میں الجھی ہوئی تھی لیکن وہ ایک کش مکش میں ضرور مبتلا تھے کہ ہندوستان کی تقسیم کیا ٹھیک ہوئی یا نہیں۔ اور جن لوگوں نے یہ فیصلے کیے کیا وہ صحیح تھے یا نہیں اور تقسیم کے بعد مزید تقسیم کیوں عمل میں آئی۔ عرفان پاکستان کے بننے کے حوالے سے ذاکر سے پوچھتا ہے کہ کیا پاکستان ٹھیک بنا تھا؟ ذہن میں شکوک وشبہات لیے یہ نسل اس نئی بستی میں شناخت کے بحران میں مبتلا ہے انہیں سیاسی بیانات اور نعروں کے ذریعے کچھ اور بتایا گیا تھا اور اب زمینی حالات کسی اور سمت جاتے دکھائی پڑتے ہیں۔ اسی فضا میں عرفان بالآخر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ''غلط لوگوں کے ہاتھوں میں آکر صحیح بات بھی غلط ہوجاتی ہے''۔ ایسا صرف نوجوان نسل کے ذہنوں میں ہی نہیں ان سے پہلی پیڑھی کے خیالات سے بھی اس کشمکش کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور ذاکر کی ماں کے ساتھ گفتگو بھی ملاحظہ کریں۔ جب ذاکر کی ماں گذری رات کے حالات بتاتی ہے کہ سوتے میں اچانک مجھے آواز سنائی دی اور میں نے تیرے باپ کو آواز دی کہ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے گولی چلی ہو تو وہ بڑبڑانے لگے کہ پاکستان میں اب یہی ہوگا۔ ذاکر جب اپنی ماں کو دلاسا دیتا ہے تو وہ کہتی ہیں ''تجھے یقین نہ آوے گا، میں تو اندر سے ہل گئی ہوں۔ پاکستان پہ اللہ رحم کرے۔'' یہ کیفیت اور بھی شدید ہوجاتی ہے جب شریفن بوا ذاکر کی ماں سے ملنے آتی ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ کرائے کے مکان میں رہ رہے ہیں۔ یہاں ملک میں جاری جعلی الاٹمنٹ اور اس کے نتیجے میں شریف خاندانوں کا المیہ بیان کیا گیا ہے جو تہذیبی قدروں کو سینے سے لگائے اس عمل کا حصہ نہیں بن پائے۔ شریفن بوا کی بات ملاحظہ کریں۔

''بی بی! برا مت مانیو! تمہارے پاکستان میں بہت آپا دھاپی ہے۔ لوگوں کے خون کیسے سفید ہوئے ہیں۔ میں تو دیکھ کے حق دق رہ گئی۔''(7)

ڈاکٹر انور سجاد نے بستی میں بیان کیے گئے اس نفسیاتی اور تہذیبی المیے کے بارے میں لکھا ہے کہ

''پاکستان کے ابتدائی ایام کس قسم کی افراتفری سے آلودہ تھے، وہ کیا حالات تھے، جن کے اثرات سے یہ قوم آج تک نہیں نکل پائی۔ وہ فکری مغالطے تھے یا تہذیبی فریب؟ اصل ماجرا کیا تھا؟ اصل ماجرا کیا ہے؟ انتظار حسین کے ناول ایسے تمام سوالوں کا کافی وشافی جواب دینے کی ایک کوشش ہیں۔ ''بستی'' ایک طویل مونولاگ ہے۔ شعوری رو، اجتماعی لاشعور، فلیش بیک، حال، اور آخری ابواب میں فلیش فارورڈ بھی۔ معروضی صورت حال کو دیومالا، تاریخ اور حکایتوں کی وساطت سے سمجھنا۔ بیان کرنا، کنکریٹ صورت حال سے گریز نہیں، بلکہ ماضی کے ساتھ حال کا تسلسل قائم کر کے قاری کے ذہن پر نقش بنانے کا ایک کامیاب طریقہ ہے۔''(8)

پاکستان میں آتے ہی یہاں کے حالات اور پھر پینسٹھ کی جنگ کے دوران نفرت کا پرچار ذاکر کے لیے عجیب ناامیدی کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ نئے ملک میں بے جڑ کے پیڑوں کی طرح پھلنے پھولنے اور نمو کی خواہش کے باوجود جب صورتحال موافق نظر نہیں آتی تو ذاکر اور اس کے ساتھی سلامت، عرفان وغیرہ بے بس اور مجہول دکھائی دیتے ہیں۔اس طرح کے حالات میں خبر افواہ اور افواہ خبر بن جایا کرتی ہے۔شہر کے حالات بیان کرتے ہوئے انتظار حسین پھر نفرت سے لبریز نعروں کا ذکر کرتے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ شہر اب ایک نئے نعرے کے سحر میں تھا یہاں یہ نعرے سیاسی ہیں اور اسی وجہ سے وقتی نوعیت کے ثابت ہوتے ہیں نئے نعرے کی آمد سے پرانے نعرے بوسیدہ ہو جاتے ہیں چاہے ان کو ہوا دینے والے اشتہار دیواروں پر لگے رہیں لیکن ان کا رنگ ماند پڑ جاتا ہے اور نیا سیاسی نعرہ ان کی جگہ لے لیتا ہے۔جبکہ تہذیبی قدریں ہمیشہ اپنا اثر برقرار رکھتی ہیں۔انتظار حسین نے اپنے ناولوں کی بنیاد اپنے افسانوں کی طرح ماضی اور ماضی کی یاد پر ضرور رکھی ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ وہ عصری تقاضوں سے بے خبر ہیں ان کے اسلوب پر داستانوی اور مذہبی عناصر، دیومالائیں اور پرانے صحائف کا اثر ہے۔اور وہ انہیں کے ذریعے سے اپنے عہد کے سوالوں کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ڈاکٹر انوار احمد اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

> ''انتظار حسین اور کہانی لازم وملزوم ہیں۔۔انتظار کے ہاں پاکستانی سیاست کے نشیب وفراز اور سماجی تغیرات کی گواہی موجود ہے۔گویا وہ ''آج'' کا شاہد ہے۔۔۔۔وہ اپنے عصری سوالوں اور حوالوں سے بیگانہ نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تاریخ وتہذیب کے پراسرار اور پیچیدہ جنگل میں اتر کر اظہار وابلاغ کے علامتی وسیلے کو معتبر بناتا ہے۔(9)

انتظار حسین ہر ایک زاویے سے موجودہ صورتحال کے ساتھ ماضی کا موازنہ کرتے رہتے ہیں اور شاید اسی وجہ سے اکثر نقاد انہیں ہمیشہ ماضی پرستی کے حوالے سے دیکھتے ہیں لیکن انتظار حسین اصل میں کئی ایک بیانیوں کے متبادل اپنے فکشن میں پیش کرتے ہیں۔جنگ کی ہولناکیاں اپنی جگہ مگر جنگ کے دوران جو پرانی اور تاریخی عمارتوں کا نقصان ہوتا ہے اس کو تہذیب کے انہدام کی ہی ایک شکل جاننا چاہیے۔انتظار حسین اس بارے میں اپنا موقف اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ آج کے نئے زمانوں کی جنگوں کا ایک نقصان یہ ہے کہ عمارتوں کو عظمت حاصل نہیں کرنے دیتیں۔اونچی اونچی عمارتیں پرانی نہیں ہونے پاتیں کہ کوئی جنگ چھڑ جاتی ہے اور بمبار طیارے انہیں مسمار کر ڈالتے ہیں۔جنگ کے بعد شہروں کی نئے سرے سے منصوبہ بندی ہوتی ہے اور پہلے سے زیادہ اونچی عمارتیں بنائی جاتی ہیں۔مگر ابھی وہ نئی ہوتی ہیں کہ پھر کوئی جنگ شروع ہو جاتی ہے اور اس سے پہلے کہ ان کے گرد عظمت اور اسرار کا ہالہ بنا جائے، گر کر ڈھیر ہو جاتی ہیں۔اسی حوالے سے ایک اقتباس پیش خدمت ہے جو انتظار حسین کے موقف کی بہتر تفہیم پیش کرتا ہے۔

> ''آج کی تازہ خبر، آگرہ کے ہوائی اڈے کو تباہ وبرباد کر دیا گیا۔کیسے؟ بلیک آؤٹ کے اندھیرے

میں مرمریں تاج جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ اس سے آگرہ کا اور آگرہ کے ہوائی اڈے کی جائے وقوع کا پتہ چل گیا اور بمباری کر کے اسے تہس نہس کر دیا گیا۔ لوگ اس خبر کو پڑھ کر اور باخبر ذرائع سے رابطہ رکھنے والے یاروں سے اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ سن کر کتنے خوش ہوئے۔ اس خبر کے ساتھ ہی تاج محل کی گری ہوئی ساکھ یکا یک بحال ہوئی ورنہ ہم یہ طے کر چکے تھے کہ تاج محل سے اور اس تاریخ سے جس نے تاج محل کو جنم دیا ہے، پاکستان کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔''(10)

پاکستان کے بننے کے بعد ہم نے اپنے قائدین کے فرمودات سے روگردانی کا رویہ جاری رکھا اور بزدلی اور غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے رہے۔ ہم نے اپنے اداروں کو مضبوط نہیں کیا ان کو شعور سے محروم رکھا اور جب بھی اجتماعی عمل کا وقت آیا ہم نے قوم بننے کی بجائے ایک بے مقصد ہجوم کی شکل اختیار کر لی۔ ہماری ان کوتاہیوں کے نتائج انتظار حسین نے اس تمثیل میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

''یہ سوچتا تھا کہ دیکھتا ہوں کہ ایک جھیل ہے۔ پانی جھیل کا کچھ اجلا کچھ گدلا۔ جھیل کے بیچوں بیچ ایک ہاتھی اور ایک کچھوا کہ ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے، مگر دونوں میں سے نہ کوئی غالب آتا تھا نہ مغلوب ہوتا تھا۔ میں حیران کھڑا اس لڑائی کو دیکھتا تھا کہ ایک مرد فقیر نمودار ہوا۔ جھیل کے قریب پہنچا۔ رک کر ہاتھی اور کچھوے پر ایک نظر افسوس بھری ڈالی اور ایک سرد آہ کھینچی۔ پھر کہا کہ کاش وہ علم سے محروم ہوتے اور زبانیں ان کی بے تاثیر ہوتیں۔..... یہ قصہ عبرت سن کر میں نے استفسار کیا کہ اے بزرگ! انجام اس لڑائی کا کیا ہوگا؟ بولا کہ جھیل کا پانی گدلا ہو جائے گا۔ میں نے کہا کہ وہ تو ہو چکا ہے۔ بولا کہ اور ہوگا۔ میں نے پوچھا، کتنا؟ کہا اتنا کہ جھیل دلدل بن جائے گی اور بستی میں خاک اڑے گی۔''(11)

''پھر کہا کہ اے عزیز! سن کہ ہماری کھوپڑیاں ہمارے بادشاہ کے سانپوں کی غذا بن گئیں۔.....اور اب اس شہر میں گنتی کے لوگ رہ گئے ہیں جن کی کھوپڑیاں ابھی باقی ہیں۔.....مقربین نے دست بستہ عرض کیا کہ جہاں پناہ! ہماری کیا مجال کہ عالی مقام سانپوں کی غذا میں کئی آمیزش کریں۔ مگر یہ کہ وہاں ہے کیا جو سانپ تناول کریں۔ کھوپڑیاں ان منتخب روزگار دانشمندوں کی مغز سے خالی ہیں۔''(12)

پاکستان میں ہندوستان دشمنی کے بیانیے کی ترویج کے بعد کی صورتحال کو بیان کرتے ہوئے انتظار حسین نے جگہ لگے ہوئے ایسے اشتہارات کا ذکر کیا ہے جن پر بھارت مخالف نعرے لکھے ہوئے تھے۔ یہ زمانہ سقوط ڈھاکہ کے قریب کا زمانہ ہے اور اس دوران ریاستی سطح پر ایسے بیانیے کی ترویج کی کوششیں بھی کی جا رہی ہیں اور اس کے نتیجے

میں الفاظ اپنی معنویت کھو چکے ہیں اور انتظار حسین کے بقول مردہ ہو چکے ہیں۔ ہوٹل شیراز میں بیٹھنے والی ٹولی کے ارکان میں سے سلامت ذاکر کو مشرقی پاکستان میں ہونے والی شکست کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے اور غصے سے کہتا ہے کہ تم سامراج کے پٹھو، تم بھولے بن کر پوچھتے ہو کیسے؟ سوچو کہ تم لڑکوں کو کیا پڑھاتے ہو؟ بادشاہوں کی تاریخ۔ افیون کی گولیاں۔ ہاں اور تمہارا باپ ذمہ دار ہے جو میرے باپ کو روز مذہب کی افیون کی ایک گولی کھلا دیتا ہے، آج بھی ایک گولی کھلائی ہے۔ میرا باپ آج تیرے مذہب پرست باپ سے صبر کا سبق لے کے آیا ہے۔ کہتا ہے: اِنَّ اللہ مَعَ الصابرینَ۔ میں نے کہا بڈھے یہ ٹوٹکے اب تمہیں نہیں بچا سکتے۔ حساب کا وقت آن پہنچا ہے۔ ادھر بازاروں کی صورتحال یہ ہوگئی ہے کہ شیراز کے باہر فٹ پاتھ پر کھڑی ایک ٹولی کی آپس میں کوئی بہت گرم بحث ہو رہی تھی اور لوگ اکٹھے ہوتے جا رہے تھے۔ کیا بحث تھی؟ یہ وہ نہیں سن سکا۔ بس بار بار ایک لفظ سنائی دیتا تھا۔۔۔غدار۔ اور پھر اچانک دونو جوان ایک دوسرے پر پل پڑے۔ اس طرح کے حالات میں الفاظ اپنی معنویت کھو دیتے ہیں اقتباس دیکھیے۔

> ''چلتے چلتے نظر دیوار پر گئی جہاں ایک بڑا سا اشتہار لگا تھا۔ گھوڑے پر سوار، ہاتھ میں تلوار، صورت خونخوار، یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے۔ اس پہ کوئی ردعمل نہیں ہوا کہ اب وہ تصویر بھی مردہ تھی اور وہ لفظ بھی۔ اگلے نکڑ پر پھر وہی اشتہار، وہی تصویر، وہی لفظ، مردہ تصویر۔ مردہ لفظ۔ اس کے تصور میں ایک جلسہ گاہ کی تصویر ابھری۔ جا بجا جھنڈیاں لگی ہوئیں، جھنڈیوں کی صورت میں بڑے بڑے اشتہارات ہوا میں لہراتے ہوئے۔ اس وقت اس کے لفظ، اس کے نقش کتنے زندہ نظر آتے ہیں۔ جلسہ درہم وبرہم ہو جاتا ہے۔ جلسہ گاہ خالی پڑی ہے مگر اشتہار اسی صورت ہوا میں پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ اس پر لکھے لفظ، بنے نقش کتنے مردہ نظر آتے ہیں۔ دنوں تک ان اشتہاروں کو کوئی نہیں اتارتا۔ برابر سے موٹر گزری پیچھے لکھا تھا کرش انڈیا۔ شاید کار والا یہ نعرہ لکھ کر بھول گیا ہے۔ نہیں تو۔۔۔نہیں تو کیا؟(13)
>
> ''کتنے ایسے اشتہاروں کو جن پر ایک ہی مضمون درج تھا اور کتنی ایسی کاروں کو جن کی پشت پر، شیشے پر ایک ہی نعرہ انگریزی کے دو لفظوں میں لکھا ہوا تھا، وہ بغیر کسی اکتاہٹ کے پڑھتا چلا گیا۔ کتنے لفظ مرے پڑے تھے۔ اسے لگا کہ نعرے نہیں پڑھ رہا۔ مری ہوئی مکھیوں پہ چل رہا ہے۔ طبیعت مالش کرنے لگی۔ دیواروں سے نظریں ہٹا کر آس پاس چلتے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ سب کے چہرے سونت سونتا کر ایک سے ہو گئے تھے۔(14)

نئے ملک اور نئے سماج میں جب فرد کو اپنی شناخت کے مسائل کا سامنا ہوتا ہے جب اسے خوابوں کی تعبیر بالکل الٹ دکھائی دیتی ہے اور زمینی حقائق اس کے ذہن میں موجود تصورات سے بالکل الگ صورت حال میں

سامنے آتے ہیں ثقافتی اور سماجی صورت حال میں اس تبدیلی کے زیر اثر اس کے اندر مختلف نفسیاتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی لایعنیت کا احساس جنم لیتا ہے۔ اردگرد کی دنیا سے بے تعلقی کا احساس ہوتا ہے اور انسان کی نفسیاتی کیفیت ایسی پیچیدہ ہو جاتی ہے کہ اسے اپنا آپ تبدیل ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح کی صورت حال میں مبتلا ایک فرد کے بارے میں یہ اقتباس دیکھیے ۔

> ''مگر یہ نہیں ہو سکا۔ اردگرد ہجوم اس قدر تھا کہ وہ بالکل پھنسا ہوا تھا۔ ایسے چل رہا تھا جیسے سیلاب میں تنکا بہتا چلا جاتا ہے۔ اس نے بے چارگی کے ساتھ اردگرد کے چہروں کو دیکھا۔ لگا کہ کھینچ کر لمبے ہو گئے ہیں، پھر چپٹے ہونے لگے۔ کھنچی گردنیں، چپٹے چہرے، منہ سرخ اور بدن جیسے پورے بدن پر بال کھڑے ہوں۔ وہ ڈرا، کہیں گردنیں کھنچتی کھنچتی اور چہرے چپٹے ہوتے ہوتے ان کی صورتیں بالکل ہی نہ بدل جائیں یا صورت بے صورت ہو جائیں۔ کیا میں ان میں سے ہوں؟ ان کے ساتھ اٹھایا جاؤں گا؟ نہیں ! پھر مجھے اعلان کر دینا چاہیے۔ اعلان اس ہجوم میں؟ سنے گا کون؟ کان پڑی آواز تو سنائی نہیں دے رہی۔ کم از کم مجھے ان کے ساتھ نہیں چلنا چاہیے۔ وہ قبرستان اپنے راستے سے جائیں، میں اپنے رستے سے۔ مجھے اس ہجوم سے جلدی نکل جانا چاہیے، مبادا میں بھی..... میری بھی گردن لمبی اور چہرہ چپٹا ہوتا چلا جائے اور گلے کی رگیں پھول جائیں اور میری صورت دفعتہً ایک شور اٹھا۔ گولی چلنی شروع ہو گئی۔(15)

ہجرت کے اس تجربے میں انتظار حسین جڑوں کے اپنی جگہ سے اکھڑ جانے کے المیہ کو بھی ماجرے کا حصہ بناتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ تاریخ میں موجود تضادات کو بھی بین السطور میں پیش کرتے جاتے ہیں۔ ذاکر کی نفسیاتی کیفیت کو سمجھنے کے لیئے ان سطور کو دیکھنا ضروری ہے جہاں ذاکر واپس جانے کے بارے میں سوچتا ہے اور وقت اور دیمک کے تعلق کے بارے میں سوال اٹھاتا ہے کہ وقت کے ساتھ چیزوں کو دیمک کیوں لگ جاتی ہے؟ انتظار حسین کے تقریباً سب ناولوں میں ایک بات ضرور پیش کی گئی ہے کہ اپنے گھر بار اور علاقے کو چھوڑنا ایک انسانی المیہ ہے اور دنیا کی سب سے بڑی ہجرت جو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہوئی اس کے اثرات کم و بیش ادب کی ہر صنف میں ہمیں واضح ملتے ہیں۔ انتظار حسین نے اپنی تحریروں میں اسلامی تاریخ کے واقعات، ہندو دیومالا، اساطیر الاولیں اور بدھ مت کی جاتک کتھاؤں سے بھی رائج بیانیے کو توڑنے اور متبادل بیانیہ تشکیل دینے کا کام لیا ہے۔ اپنی ہر کہانی میں وہ کسی نہ کسی واقعے کو کہانی کے ساتھ ساتھ ایسے منسلک کرتے ہیں کہ کہانی کی معنویت اور گہری ہوتی جاتی ہے اور قاری پر اس کا اثر بھی گہرا ہوتا ہے۔ ان اثرات کے علاوہ ان واقعات کو کہانی کا حصہ بنانے سے انتظار حسین کے اسلوب میں بلاغت کو تقویت ملی ہے اور قاری کے لیئے کہانی کو سمجھنا آسان ہو گیا ہے۔ ہجرت کے تناظر میں مندرجہ ذیل اقتباس دیکھیے کہ گوتم بدھ کے اپنے شاگردوں کے ساتھ ایک مکالمے کو پیش کرنے سے کیا بیانیہ تشکیل پا رہا ہے

اور کس بیانیے پر براہ راست تہ بالا کرنے کی کوشش محسوس کی جاسکتی ہے۔

''ایک مسافر نے کسی جنگل سے گذرتے گذرتے دیکھا کہ ایک چندن کے پیڑ میں آگ لگی ہوئی ہے۔ شاخوں پر بیٹھے پرندے اڑ چکے ہیں، مگر ایک راج ہنس شاخ پہ جما بیٹھا ہے۔ مسافر نے پوچھا کہ اے راج ہنس! کیا تو دیکھ نہیں رہا کہ چندن میں آگ لگی ہوئی ہے؟ پھر تو یہاں سے اڑتا کیوں نہیں؟ کیا تجھے اپنی جان پیاری نہیں؟ ہنس بولا کہ اے مسافر! میں نے اس چندن کی چھاؤں میں بہت سکھ پایا ہے۔ کیا یہ اچھا لگتا ہے کہ اب جب کہ وہ دکھ میں ہے، میں سے چھوڑ کر چلا جاؤں؟''

افضال چپ ہو گیا، پھر بولا۔

''جانتے ہو وہ کون تھا؟ شاکیہ منی نے جاتک سنائی، بھکشوؤں کو دیکھا کہا کہ ہے بھکشوؤ! جانتے ہو وہ راج ہنس کون تھا؟ وہ راج ہنس میں تھا۔''(16)

ہندوستان کی اس بستی جہاں سے ہجرت کر کے ذاکر اور اس کا خاندان یہاں آیا تھا کی حالت زار بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہاں اب کچھ بھی ویسا نہیں رہا جیسا کہ وہ تقسیم سے پہلے تھا اور تقسیم کے پہلے کے حالات انتظار کی کہانیوں میں ہمیں پرامن ہی دکھائی دیتے ہیں نہ صرف پرامن بلکہ ان کا نقشہ انتظار حسین نے جس طرح کھینچا ہے اور ان میں تبدیلی کا جس انداز میں ذکر کیا ہے یہ بجائے خود ایک متوازی خیال بن کر سامنے آرہا ہے۔ اقتباس دیکھیے۔

''نہ شانتی کی شبد، نہ شردھا کی ورشا۔ بانسری کی مدھر تان ٹوٹ چکی تھی۔ بھکتیرس کہیں نہیں تھا۔ جل سکھل، اتھل پتھل۔ نرناری بیاکل۔ جنتا گھروں سے نکلی ہوئی، جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے۔ سدا چاریوں پہ انیائے ہو رہا تھا۔ ساوتری ایسی استریوں کی ساڑھیاں لیر لیر تھیں۔ سیندور سے بھری مانگیں اجڑ رہی تھیں۔ بھری گودیں خالی ہو رہی تھیں۔ بالکوں کے منکے ڈھلے تھے، پتلی بھری تھی۔ میں بھوچک کہ اس نگری کا رکھشک کہاں ہے؟ ایک جٹا دھاری مجھ پہ گرجا۔ ''مورکھ، اس نگری کا رکھشک جگ نستار نہار تھا۔ پر اس نے یاں سے ڈیرہ اٹھایا اور جنگل میں جا براجا۔''(17)

اسی طرح ذاکر کے دوست کے خط میں ذاکر کی خالہ زاد جو وہیں ہندوستان میں رہ جاتی ہے کے بارے میں بیان اور اس میں موجود تاریخی تضادات قابل غور ہیں۔ مسلمان فاتحین کے ذکر کے بعد مسلمان حکمرانوں اس کے بعد تحریک آزادی کے ساتھ منسلک سیاسی رہنما؟ں کا ذکر کرنے کے بعد صابرہ کا ذکر ایک دفعہ تو عجیب لگتا ہے

لیکن ذرا سا غور کرنے پر معنی کی پرتیں کھلنے لگتی ہیں اور ایک متوازی حقیقت کے آشکار ہونے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔

''یار ذاکر! یہ تمہاری صابرہ مجھے تو لڑکی سے زیادہ تاریخ کا ایک عجوبہ نظر آتی ہے۔ یار برا مت ماننا، تم لوگوں کی تاریخ ہندوستان میں عجب اوبر کھابڑ چلی ہے۔ پہلے تمہارے فاتحین آئے اور اس زور و شور سے آئے کہ ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے یہاں کی زمین ہل گئی اور تلوار کی جھنکار سے فضا گونج اٹھی۔ پھر سیاسی رہنما نمودار ہوئے اور انہوں نے اپنی گھن گرج دکھائی۔ بابر، اکبر، شاہجہاں، اورنگزیب..... پھر سر سید احمد خان، مولانا محمد علی، محمد علی جناح، اور ان سب کے بعد تمہاری صابرہ۔ بھرے ہندوستان میں اکیلی رہ جانے والی ایک اداس اور خاموش لڑکی۔ پتہ نہیں یہ تمہاری تاریخ کا کمال ہے یا تہذیبوں کی تاریخ اسی طور چلتی ہے۔ شمشیر و سناں اول.....اور آخر؟ تمہارے حکیم الامت کی نظر اس آخر پر بھی تھی یا نہیں تھی۔ تقدیر امم کا ایک رنگ یہ بھی ہے۔''(18)

انتظار حسین واقعہ کربلا کو بھی علامتی طور پر اپنی کہانیوں میں موجودہ حالات سے جوڑ کر بیان کرتے ہیں۔ حق اور سچ بات کہنے کی جرات رکھنے والے انسانوں کی کم یابی کو محسوس کرتے ہیں اور قدیم روایات کے ذریعے قاری کو متبادل رخ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب دانا لوگ بات کہنے کی اہلیت اور صلاحیت کھو دیتے ہیں تو جوتے کے تسمے باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ایسے وقت میں بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ دانشوروں کو بھی چپ ہونا پڑتا ہے۔ نیچے دیے گئے اقتباس میں قابل غور جملہ ہے کہ جب گیدڑ بولنے لگیں تو شیر چپ ہو جایا کرتے ہیں۔

''مت بولو مبادہ تم پہچانے جاؤ۔ تب گوتم بدھ نے زبان کھولی کہ ایک گھنی بنی میں ایک شیر رہتا تھا۔ رت بسنت کی، رات پور نماشی کی۔ شیر اپنے بالک کے سنگ جنگل میں منگل منا تا تھا۔ ایک بار ایسا دہاڑا کہ جنگل سارا گونج گیا۔ شیر بولا کہ ہے میرے پتر! ایک بات اپنے پتا کی انٹی میں باندھ رکھ کہ جب گیدڑ بولتے ہیں تو شیر چپ ہو جاتے ہیں۔ یہ کہہ کر بدھ دیو جی چپ ہو گئے۔ لمبے سمے چپ رہے تو بھکشو دبدا میں پڑ گئے کہ کہیں پھر چپ ہونے کا سمے تو نہیں آ گیا۔ جب دانا چپ ہو جائیں گے اور جوتے کے تسمے باتیں کریں گے۔ یہ جوتے کے تسمے کی باتیں کرنے کا وقت ہے۔ سو مت بولو مبادا تم پہچانے جاؤ۔(19)

''تذکرہ'' کے مرکزی کردار اخلاق اور بو جان ہیں۔ ہجرت کے بعد زندگی میں پھیلتے انتشار اور انتظار حسین کے ہر ناول کی طرح ماضی کی یادوں کا جھمگٹا اس کہانی میں بھی موجود ہے لیکن اس کے باوجود اخلاق تنہا ہے

اور بے بسی اور مایوسی کی کیفیت میں گرفتار ہے۔ اسی لیے ناول میں سوالیہ انداز سے بیان کرتا ہے کہ کب تک ان کالے پانیوں میں چلیں گے۔ کب تک؟ اس لمبی کالی رات کا کوئی انت ہے کہ نہیں۔ اجالا اور کنارہ ہے کہ نہیں اور درخت؟ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ جڑوں کے بغیر زندگی بسر کرنا اور زندگی کا کسی ایک نقطے پر رک جانا کس قدر المناک ہے۔ اس ناول میں ''بستی'' کی طرح محض ماضی کا دکھ نہیں ہے بلکہ کہانی اس سے آگے بڑھ کر زندگی کی تیز روی کو بھی بیان کر رہی ہے۔

''آگے سمندر ہے'' بھی ہجرت کے تجربے کی توسیع ہے۔ انتظار حسین نے ''بستی'' میں لاہور شہر کی صورتحال تقسیم کے بعد کے حوالے سے آپ کے سامنے پیش کی ہے جبکہ ''آگے سمندر ہے'' میں یہ صورتحال کراچی کی ہے۔ جواد کی ہجرت اور مجو بھائی کی نئے نگر میں جواد سے دوستی اور پھر جواد کی یادیں اور مجو بھائی کی بے فکری اور مجہولیت اس ناول کے مجموعی بیانیے کو تشکیل دیتی ہے جو آزادی کے اس نظریے سے متصادم محسوس ہوتا ہے جو سیاسی طور پر اس ملک کے قیام کے وقت قوم کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ کراچی میں معاشی، اقتصادی، تہذیبی اور سیاسی انتشار اور مسلمان کی مسلمان کے ہاتھوں موت، بڑھتی ہوئی دہشت گردی یہ وہ مسائل ہیں جو اس ناول کی کہانی کے ذریعے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ انتظار حسین نے مجو بھائی کے ذریعے سے زیادہ تر باتیں وہ پیش کی ہیں جن پر سنجیدگی سے غور کرنا ضروری ہے حقیقت کا چھپانا یا مسخ کرنا قوموں کے لیئے ہمیشہ نقصان دہ ہوتا ہے۔ جواد میاں کے خیالات معاشرتی حقائق پر مبنی ہیں۔

ناول کے آغاز سے ہی انتظار حسین اپنے مخصوص انداز میں اندلسی مسلمانوں کے تہذیبی پس منظر کے ساتھ ہجرت کے تجربے کو جوڑتے ہیں۔ ہسپانیہ میں عبدالرحمٰن اول کے بوئے ہوئے کھجور کے درخت کا ہسپانیہ کی صحرائی زندگی پر خوشگوار اثر پڑا۔ یہ درخت شیخ ابوالحجاج کے گھر میں اپنی جڑیں یوں پیوست کر چکا ہے کہ درخت کے نیچے موجود کنویں تک پہنچنا بھی دشوار ہو گیا ہے۔ انتظار حسین کے بیانیے میں ماضی کی یادیں، مظاہر کائنات، اساطیر، جاتک کتھائیں اور مخلوقات کا بیان اس طرح گتھا ہوا ہوتا ہے کہ پہلے سے موجود متن ماضی کے قصے کی بجائے ایک ہمہ وقت موجود متن کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

انتظار حسین کا اپنے فن کے حوالے سے خیال ہے کہ ''زندہ تعلق میرا کتابوں سے نہیں مخلوقات سے رہا ہے'' ناول کے متن میں بھی یہ بات پیش کی گئی ہے کہ جانوروں میں بلی اور بندر دو ایسی مخلوق ہیں جو انسانی تحت الشعوری محرکات اور جبلتوں میں انجانے طریقے سے شریک رہتے ہیں ان کے ساتھ ساتھ درخت بھی۔ ابوالحجاج کی کالی بلی جو صرف روشن ضمیر لوگوں سے بغل گیر ہوتی ہے۔ انتظار حسین کے لیے ویاس پور کے لوگ وہاں کے جانور اور درخت سب کے ساتھ اٹوٹ رشتوں میں جڑے ہیں جو ہجرت کے سبب ٹوٹ جاتا ہے۔ جواد اور مجو بھائی کے درمیان ایک سفر کی بات ہو رہی ہے اور وہ سفر ہے جواد کا جو اس نے ہجرت کرنے کے کچھ عرصے کے بعد اپنی جنم بھومی ویاس پور کے لیئے کیا تھا اور وہاں جانے پر بھی سوائے کرب کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ جواد کے لیئے انسان بھی درخت کی

طرح پھلتے پھولتے اور پھل اور سایہ دیتے ہیں اس لیئے انہیں ان کی جگہ پر قائم رہنا چاہیے۔اسی لیے اس کی ہر بات میں کہیں نہ کہیں سے درخت آموجود ہوتا ہے۔مجو بھائی سے بات چیت کے دوران جواد کا یہ کہنا کہ ''ہاں درختوں کی گرفت بہت مضبوط ہوتی ہے'' اس بات کی دلیل ہے۔مجو بھائی شہروں کی جڑیں ہونے کے قائل ہیں اور کراچی میں آ کر بسنے والے مہاجروں کو بھی طرح طرح کے خیال کرتے ہیں ناول کے ابتدائی حصے میں امرو ہے اور لکھنؤ کے حوالے سے یہ ماجرا درج ہے۔پروفیسر ارتضیٰ کریم کا خیال ہے کہ

> ''انتظار حسین کے بارے میں یہ ہی خیال عام ہوگیا ہے کہ وہ رجعت پسند ہیں اور ماضی کی بازیافت یا نوحہ خوانی پہ یقین رکھتے ہیں جب کہ اس ناول کے تعلق سے کہا جاسکتا ہے کہ انتظار حسین کی تحریروں میں فرد اور سماج کے زوال سے اس قصر ذلت سے نکلنے اور نکالنے کی تدبیر اور فکر کارفرما نظر آتی ہے۔''(20)

مجو میاں جو جواد کا بے تکلف دوست ہے یوں لگتا ہے کہ جواد کے ہی وجود کا دوسرا حصہ ہے جو آئینے کی طرح ہے اور جواد جو اس ناول کا مرکزی کردار ہے کو ہمہ وقت روکتا ٹوکتا رہتا ہے۔ناول کے سارے کردار ہجرت کے نتیجے میں اپنی زمین سے رشتہ توڑ کر سمندر کنارے بسے شہر کراچی میں آ بستے ہیں لیکن اپنی جڑوں کے کٹنے کا احساس شدید ہے اور اب یہ سب نئے دیس میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔جبکہ ناول میں بیان کیا گیا ہے کہ

> ''سمندر کے کنارے بسے ہوئے شہر کی کہیں جڑیں ہوا کرتی ہیں وہ تو پانی میں تیرتا ہے۔''(21)

سمندر کنارے بسے ہوئے اس شہر میں ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے لوگوں میں ذات حسب نسب کی بنیاد پر تفاخر پایا جاتا ہے۔سب کا ماضی مختلف ہونے کے باوجود صورت حال سب کی ایک جیسی ہے۔لیکن ہر ایک دوسرے کے سامنے اپنے آباؤ اجداد کی نسبت سے اپنے آپ کو بڑا ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔شہر کے حالات دن بدن تبدیل ہو رہے ہیں اور تشدد کی طرف بڑھتا ہوا رجحان سب کو پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ذیل کا اقتباس دیکھیے۔

> ''وہ جو اس شہر میں امی جمی تھی، وہ اچانک غائب ہوگئی ڈاکے، اغواء، قتل کی وارداتیں، بم دھماکے، اچانک نقاب پوش نمودار ہوتے بھرے بازار میں گولیاں چلاتے ایک یہاں گرا پڑا ہے، دوسرا وہاں تڑپ رہا ہے۔جسم دیکھتے دیکھتے ٹھنڈے پڑ جاتے۔بازار میں بھگدڑ مچ جاتی۔پھر سناٹا اور پھر اچانک ٹائر جلنا شروع ہو جاتے۔ٹائروں کے جلتے جلتے کوئی بس زد میں آجاتی اور منٹوں میں جل کر خاکستر ہو جاتی۔دکانیں کھلتے کھلتے پھر بند ہو جاتیں۔کرفیو لگ جاتا۔کرفیو آج یہاں، کل وہاں۔(22)

تقسیم کے بعد برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی اور سماجی زندگی میں ہونے والی تبدیلیوں اور ان تبدیلیوں کے محرکات ان کے ناول اور افسانوں میں واضح نظر آتے ہیں۔ان کی سیاسی وابستگی صرف برصغیر کے مسلمانوں سے ہی نہیں بلکہ جنوبی ایشیا میں موجود مسلمان قوم کے ساتھ ہے۔کئی سو سال تک ہندوستان پر حکومت کرنے والی قوم جب تقسیم کے بعد مزید تقسیم کے عمل سے گذرتی ہے تو ان کے لیے شناخت کا مسئلہ مزید گھمبیر ہو جاتا ہے۔انتظار حسین نے اپنے ناول اور افسانوں میں پاکستانی قوم کی انفرادیت اور شناخت کا حوالہ اسلامی تہذیب کو بنایا ہے ان کے لیے اسلامی تہذیب صرف عرب کی تہذیب نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب میں موجود مسلمانوں کیثقافتی مظاہر بھی ان کے لیے اہم ہیں۔انتظار حسین اس مشترکہ تہذیبی تجربے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''خالص اسلامی تہذیب کی اصطلاح نہ اس وقت میری سمجھ میں آتی تھی اور نہ اب آتی ہے کیوں کہ میرا خیال ہے کہ اسلام جہاں جہاں بھی گیا ہے اس کا وہاں کی سرزمین سے، جغرافیہ سے، پرانی داستانوں اور حکایتوں سے میل رہا ہے جیسا کہ ایران میں ہوا اور جیسا کہ ہندوستان میں ہوا۔تو یہ دو مثالیں تو ہمارے سامنے ہیں اور اگر کہیں ایسا نہیں ہوا تو میرے خیال میں وہاں اسلام کا تجربہ پوری طرح سے کامیاب نہیں ہوا۔یہ تجربہ وہیں کامیاب ہوا ہے جہاں اس نے اس سرزمین سے اپنا رشتہ جوڑ لیا تو مجھے اسلام کی کامیاب شکلیں ایران اور ہندوستان میں نظر آتی ہیں۔''(23)

انتظار حسین نے اپنے فکشن میں مشرقی تخیل کو مغربی تعقل اور گنگا جمنی تہذیبی روایت کو قیام پاکستان کیبعد تشکیل کی گئی تہذیبی شناخت کے سامنے متبادل بیانیے کے طور پر پیش کیا ہے--یہاں یہ بات توجہ طلب ہے کہ انتظار حسین کیا اس تہذیب کی بازیافت چاہتے ہیں یا احیاء بازیافت اور احیاء میں فرق قائم کرنا ضروری ہے اور یہاں میں ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے اس خیال سے متفق ہوں جس کے مطابق احیاء اور بازیافت دونوں نوآبادیات کی علمیاتی اور ثقافتی اجارہ داری کا ردعمل ہیں،مگر احیاء مقامی باشندوں کے یہاں قدامت پسندی کو رومانوی تصور کو راسخ کرتا ہے نیز قدامت پسندی کا مابعد الطبیعاتی جواز بھی گھڑتا ہے، جب کہ بازیافت کا عمل گمشدہ ماضی کی مستند دریافت کرتے ہوئے، اسے زمانہ حال میں نئے سرے سے بامعنی بناتا ہے- چناں چہ احیاء قبل نوآبادیاتی دنیا (یعنی 'پری کولونیل ازم') کی طرف لوٹنے کا عمل ہے، اور بازیافت ردنوآبادیات (یعنی 'ڈی کولونائزیشن') کا عمل ہے-(24) اور اسی حوالے سے ان کے فکشن کا بیشتر حصہ رائج بیانیوں کو توڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور متبادل بیانیہ پیش کرتا ہے-

حواشی:

۱۔ شافع قدوائی، ڈاکٹر، فکشن مطالعات (پس ساختیاتی قرات) (ملتان: بیکن بکس، ۲۰۲۵ء)، ص: ۱۳۲

۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، بے جڑ لوگوں کی بستی، مشمولہ سہ ماہی ادبیات' خصوصی شمارہ، انتظار حسین نمبر، اسلام آباد،

ص:۱۶۳

۳۔ انتظار حسین بستی، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء)، ص:۹

۴۔ ایضاً، ص:۳۳

۵۔ ایضاً، ص:۳۷

۶۔ ایضاً، ص:۱۱۱

۷۔ ایضاً، ص:۸۴

۸۔ انور سجاد، انتظار حسین پر چند نوٹ، مشمولہ انتظار حسین، ایک دبستان، مرتبہ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۲ء)، ص:۴۰۵

۹۔ انوار احمد، ڈاکٹر، ''اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ'' (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء)، ص:۴۱۵

۱۰۔ انتظار حسین بستی، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء)، ص:۱۳۹

۱۱۔ ایضاً، ص:۱۴۵

۱۲۔ ایضاً، ص:۱۴۸

۱۳۔ ایضاً، ص:۱۵۹

۱۴۔ ایضاً، ص:۱۶۰

۱۵۔ ایضاً، ص:۲۰۳

۱۶۔ ایضاً، ص:۱۳۳

۱۷۔ ایضاً، ص:۱۹۵

۱۸۔ ایضاً، ص:۱۲۰

۱۹۔ ایضاً، ص:۲۰۷

۲۰۔ ارتضیٰ کریم، نیا سفر (الہٰ آباد، شمارہ ۹۔۱۰)، ص:۳۷۵

۲۱۔ انتظار حسین، آگے سمندر ہے، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص:۱۶

۲۲۔ ایضاً، ص:۱۳۱

۲۳۔ الطاف احمد قریشی، ادبی مکالمے (لاہور:، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۶ء)، ص:۸۳۱

۲۴۔ ناصر عباس، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تشکیل جدید'' (لاہور: اوکسفرڈ، ۲۰۱۶ء)، ص(ذ)